Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

نتاشا

پی ایچ۔ڈی اسکالر، نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ

ڈاکٹر سید طاہر علی شاہ

صدر شعبہ اردو، نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ

اکبر الہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا اجمالی جائزہ

Natasha
PhD Scholar, Northern University, Naushehra
Dr. Syed Tahir Ali Shah
Head of Urdu Department, Northern University, Nowshera

A brief review of the satirical and humorous poetry of Akbar Allahabadi

"Lissan Ul Asar" (Epoch's Language) Akbar Alaabadi is one of the ever-shining stars in the realm of Urdu literature that is exempted of the space and time. By reading Akbar Alaabadi verses one enjoys it with a smiling face but whereas his poetry is to be observed but one feels guilt of shame as his poetry has been overviewed as a bird's eye views. Where ever his poetry his studied deeply and corely, some of the realities emerged as he had described one and a hundred years ago, and of course it is too late to comprehend it up. Akbar Alaabadi passed his life against western civilization for he was aware of the abuses and devastation of wester civilization. His sanity had reached at such a level, we are knowing and understanding still. Akbar Alaabadi has a unique identity and high level in comic poetry. His poetry comprises of each style and theme. He narrated the comic in such a style that his greatness, dictions and felicity is surprising. The uniqueness of Akbar Alaabadi is uttal, and above all, being a good poet, he is sane and realistic and along with it he is the pioneer of knowing the changing and lasting effects of the civilizations and could refrain it. His name would be remembered forever in the realm of Urdu comic Poetry.

 Corresponding Author's Email: tahir_shah56@yahoo.com

اکبر الہ آبادی کا شمار اُردو ادب کے نامور طنز و مزاحیہ شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ صرف اپنے عہد کے شاعر نہ تھے بلکہ آپ کی شاعری میں آفاقیت موجود ہیں جو ہر عہد کے لیے مشغلِ راہ ہے۔ اُردو ادب کے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی کو کسی بھی طرح سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے ہر موضوع پر لکھا اور جہاں کہی معاشرے میں تضاد یا کوئی برائی نظر آئی تو اپنے طنز کے تیر اُس طرف موڑ دیئے۔ اکبر الہ آبادی صرف طنزیہ و مزاحیہ شاعری نہیں کرتے بلکہ مصلح قوم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری سر انجام دیتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی ان عظیم شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری سے قوم کی اصلاح کی۔ اُن کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں مقصدیت نمایاں تھی۔ اکبر الہ آبادی مغربی تہذیب، بے پردگی اور مخلوط تعلیم کے سخت خلاف تھے۔ آپ مغربی تہذیب اور تعلیم کے خلاف سراپا اختجاج تھے اور اس قدر شدت سے مخالفت کی کہ بہت سے لوگ بھی آپ کے خلاف ہوگئے۔ آپ کو اپنی تہذیب مٹتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور آپ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر یونہی مغربی تہذیب پھلتی پھولتی رہی تو ہمارے تہذیب فنا ہو جائے گی اور ہم جو آگے بڑھنے کا سوچ رہے ہیں وہ بھی کجا ہماری اخلاقی قدریں ہی مٹ جائیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے بھی جتن اور تبلیغ کر رہے تھے۔ اکبر جیسے باشعور اور خوددار شاعر اپنی تہذہب کو مٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی اسلام کو عیسائیت کے پردے میں چھپنے دے سکتے تھے۔ آپ رسما انگریزوں اور مغربی تہذیب کے خلاف نہیں تھے بلکہ آپ کی دور اندیشی ہی تھی جس کی وجہ سے آپ مخالفت پر آمادہ ہوئے تھے۔ اسی حوالے سے شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں۔

اکبر پہلے شخص تھے جن کو بدلتے ہوئے زمانے، اس زمانے میں اپنی تہذیبی قدروں کے لیے خطرہ، اور انگریزی تعلیم و ترقی کو انگریزی سامراج کے قوت مند شمار ہونے کا احساس شدت سے تھا۔ انھوں نے اس کے مضمرات کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس معاملے میں گاندھی اور اقبال بھی ان کے بعد ہیں۔ انھوںنے سرمایہ داری اور نو آبادیاتی نظام میں مضمر کئی خطرات کو محسوس کر لیا تھا، وہ رسما انگریزی کے مخالف نہیں تھے۔(۱: شمس الرحمان فاروقی، ۲۰۰۲ء)

مغربی تہذیب یا مغرب کی مخالفت اکبر الہ آبادی کے ہاں ایک مکمل نظامِ فکر کی صورت میں ہیں اور ایسا نہیں کہ یہ ایک روایت یا بس ایک رویے کی صورت میں ہو۔ اکبر الہ آبادی انگریزی تعلیم کے مضمر اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی پہلی شکایت یہ تھی کہ انگریزی تعلیم صرف نوکری کا ذریعہ بنتی ہے اور اس سے انسان ''صاحبِ دل'' نہیں بن پاتا۔ یہ شکایت اپنے اندر بے تحاشا گہرائی رکھی ہے۔ جب انسان ''صاحبِ دل'' نہ بنے تو وہ آگے کیسے بڑھ سکتا ہے؟ جو شخص خود کو نہ پہچان پائے وہ دنیا، لوگوں اور خدا کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ ترقی کیسے کر سکتا ہے؟ دنیا کو مسخر کیسے کر سکتا ہے؟

جب اس کی سوچ صرف نوکری ہی تک محدود ہو تو وہ اجتماعی فلاحی کے لئے کیسے سرگرداں ہو سکتا ہے؟ جب کے وہاں تو انفرادی فلاح ہی زیرِ نظر رہتی ہیں۔ اسی حوالے سے اکبر اپنے خیالات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے

جناب ڈراون کو حضرت آدمؑ سے کیا مطلب۔ (۲:اکبر الہ آبادی، ۱۹۹۸ء)

اکبر الہ آبادی نے مغربی تعلیم اور کالج کو بار بار طنز کا نشانہ بنایا۔ آپ سوچتے تھے کہ جدید تعلیم نئی نسل میں احترام کے جذبے کو مجروح کر کے اُن کے مزاج کو خراب کر رہی ہیں۔ آپ کے مطابق جدید تعلیم اخلاقیات پر توجہ نہیں دیتی جس کی وجہ سے انسانی قدریں اور اسلاف کی روایات پامال ہو رہی ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اکبر الہ آبادی کا نظریہ بالکل واضح ہے اور اکبر نے تعلیم نسواں کے موضوع کو بھی اپنی شاعری میں خوب سمویا ہے۔ اکبر الہ آبادی عورتوں کی تعلیم کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک جاہل عورت ایک اچھی ماں، بیٹی اور بہن نہیں بن سکتی جب کہ ایک تعلیم یافتہ عورت ایک بہترین معاشرے کو تشکیل دے سکتی ہے لیکن بات صرف اتنی ہے کہ انہیں لڑکوں کے ساتھ ہی تعلیم دینا کیوں ضروری ہے؟ جب دونوں کے فرائض، ذمہ داریاں اور دائرہ عمل ایک جیسا نہیں تو پھر مردوں اور عورتوں کو یکساں تعلیم اور یکساں نصاب دے کر ان کی ضرورتوں کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے؟ جب دونوں کی ضروریات الگ الگ ہیں تو پھر یکساں نصاب اور مخلوط تعلیم ہی کیوں ضروری ہے؟۔ ایسے ہی چند اعتراضات اکبر الہ آبادی اٹھاتے ہیں کیوں کہ اکبر مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور مغرب کی تہذیب کو اپنے اندر سمانے نہیں دیتے کیوں کہ اگر مغربی تہذیب مخلوط تعلیم کی صورت میں آئی تو معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جائے گا۔ ان اعتراضات کے علاوہ اکبر الہ آبادی عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں تھے بس آپ حدود میں رہنا، اپنی حقیقت اور اصلیت نہ بھولنے کا درس ضرور دیتے تھے۔ اسی حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو

جائز ہے غباروں میں اُڑو چرخ کو چھو لو

ہر ایک سخن بندہ عاجز کا رہے یاد

اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو۔ (۳:اکبر الہ آبادی، ۱۹۹۸ء)

اکبر الہ آبادی نے نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں رنگ بھرا بلکہ انھوں نے زبان وبیان کے حوالے سے بھی اُردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں بیش بہا اضافہ کر کہ قیمتی سرمایہ ادب کے نام کیا۔ اکبر الہ آبادی زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے انگریزی زبان کو بھی ایسے دلکش اور برجستہ انداز میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا کہ مزاح نگاری مزید پرُلطف ہو گئی۔ انگریزی زبان کے رائج الفاظ جو اس دور میں اپنی جڑیں پکڑ رہے تھے ان کے ذریعے مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کرنے والوں اور مغربی تہذیب کی ظاہر پرستی کو بھرپور طنز کا نشانہ بنانے کے ساتھ اُن ہندوستانیوں پر بھی بھرپور چوٹیں کیں جو مغرب پرست تھے۔ اسی حوالے سے پنڈت کشن پرشاد کول، اکبر الہ آبادی کے حوالے سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

اکبر کو غیر مانوس لفظوں بالخصوص انگریزی اور ہندی کے لفظوں کو شعر میں کھپانے اور نباہنے کا کچھ ایسا سلیقہ تھا اور یہ بھی طنز وظرافت

کے رنگ اور زمین میں کہ لفظ لفظ نہیں رہ جاتے بلکہ نگوں کی طرح چمکنے لگتے تھے۔ جو مرصع کار کا کام ہو۔(۴: پنڈت کشن پرشاد کول، ۱۹۵۰ء)

اکبر الہ آبادی مشرقی شعراء میں ایسے منفرد شاعر ہیں جن کی شاعری ظرافت کی چاشنی سے مالا مال ہونے کے ساتھ ایسا شگفتہ اور لطیف انداز میں مغربی تہذیب کی تقلید کرنے والوں کو طنز اور تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ قاری اس کے اثر سے خود کو بچا نہیں پاتا۔ اکبر الہ آبادی یہی چاہتے ہیں کہ بے جا مغرب پرستی سے آزادی ممکن ہو اور لوگوں کی اصلاح ہو جائے۔ اکبر دلکش فریب سے باز رہنے کی تلقین اس لیے کرتے تھے کیوں کہ وہ مغرب کو مشرقی عقل و شعور کا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں ایک رجحان قومیت بھی ہے وہ قومی اتحاد پر بہت زور دیتے ہیں۔ آپ نے ان پہلوؤں کی شدید مذمت کی ہے جو باہمی نفاق کا سبب بنتی ہے اور قومی و ملکی اتحاد کو نقصان پہنچاتی ہے۔ آپ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ بے شک ہمارے مذاہب مختلف، زبانیں الگ، رہن سہن جدا ہی کیوں نہ ہو لیکن بحیثیت ہم ایک قوم ایک ہندوستانی ہیں۔ اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو اکبر الہ آبادی جو تمنا اپنے دل میں لیے ہوئے تھے اس کے پسِ منظر پردہ ایک جذبہ تھا اور اسی جذبے کے تحت اکبر ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ختم کرنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ جو قومیں غلام بن جاتی ہے وہ قوم اپنا وقار کھو دیتی ہیں اور جب قوم اپنا وقار کھو دیں تو باقی کچھ بھی نہیں رہتا۔

اکبر الہ آبادی یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ غلامی سے موت بہتر ہے اور اسی حوالے سے اپنے خیال کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں۔

حضور عرض کروں میں جو نا گوارنہ ہو وہ یہ کہ موت ہی بہتر ہے جب وقار نہ ہو۔(۵:اکبر الہ آبادی،۱۹۹۸ء)

مشرقی اور مغربی تہذیب کے باہم ٹکراؤ کی عکاسی اکبر الہ آبادی کی شاعری ہے۔ اکبر الہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے موضوعات میں شیخ اور برہمن کی عیاریاں، مذہبی زوال، قوم کے قول و فعل میں تضاد، سیاست، ریاکاری و مکاری، سماج کی بے راہ روی، لسانی تعصب، جدید مغربی تعلیم، جدید مغربی تہذیب، بے پردگی وغیرہ شامل ہیں۔

فنی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو اکثر ناقدین نے اکبر الہٰ آبادی کی شاعری کو بذلہ سنجی کہا ہے کیوں کہ آپ زیادہ تر رعایت لفظی اور الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ آپ کی شاعری تخیل اور معنی آفرینی سے خالی نہیں بلکہ ان کے ہاں ادبی عناصر کی فروانی کے نمونے بھی کثرت سے موجود ہیں اور یہ خصوصیات بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہے۔ آپ کے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں لطیفہ گوئی، استعارات و علامات، تقابل و تضاد، صنائع لفظی و معنی وغیرہ کے لوازمات شامل ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں علامات کا استعمال بھی حد اچھے انداز سے کیا ہے اور یہ علامات مغربی تہذیب اور انگریزوں کے خلاف استعمال کی ہے۔ انجن، ریل، ایروپلین، کمپ اور پمپ جیسے الفاظ کو علامت نگاری کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے ان تمام اشیاء کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جن کا رشتہ ہندوستانی ترقی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو انگریزوں نے ریل چلائی تو کیا اس کے پیچھے ان کا مقصد ہندوستان کو ترقی دینا تھا؟ سر سری طور پر اگر اس کا جواب ہاں میں بھی ہو سکتا ہے لیکن در حقیقت انگریزوں کا مقصد اس سے ہر گز ہندوستان کو ترقی دینا نہیں بلکہ اندرونی علاقوں میں خام مال تک رسائی ممکن بنانا تھا۔ اب یہی خام مال برطانیہ میں انقلاب کے حوالے سے کیا اہمیت رکھتا ہے؟ اور اس خام مال نے ہندوستان کی صنعتی ترقی پر کیا اثرات مرتب کیے؟ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں اسے آسانی کے ساتھ پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے "برگد" کی علامت ہندوستانیوں کے لیے استعمال کی جو دور اندیشی اور دل کی بینائی سے محروم تھے۔ یہ استعارہ ان لوگوں کے لیے تھا جو جانے انجانے میں انگریزوں کے وفادار بنے ہوئے تھے اور ان کی تہذیب کو اپنائے ہوئے انہیں کے راستوں پر چل نکلے تھے۔ اس کے علاوہ اکبر نے "کیمپ" کی علامت مغربی معاشرت کے لیے استعمال کی ہے اور یہ بتانے، پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی معاشرت ہمارے مشرقی معاشرت سے بالکل ہم

آہنگی نہیں رکھتا اور اگر ہم اپنی روایات کو بھلا کر مغربی معاشرت کے دلدل میں گرتے ہیں تو پھر ہم اُٹھ نہیں پائینگے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکبر الہ آبادی نے ''توپ'' کو مغربی سامراجی قوت کے طور پر استعمال کیا اور اپنے لوگوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ قوتیں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہو جائینگی اور ہندوستان کے لوگ ان کی غلامی میں ہی رہ جائینگے۔ آپ نے ''انجن'' کا استعارہ بھی استعمال کیا جس کو قوت پھیلانے والے ذرائع کی جگہ خوب وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے لے کر آئے۔ آپ نے ایسے کئی علامات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور بے حد خوب صورت انداز سے علامات کے ذریعے انگریزوں کو اور ان کی ایجادات سے پردہ اٹھانے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی اور آپ کی یہ کوشش ہندوستان اور ہندوستان کے لوگوں کی فلاح اور ان کی حریت کے حوالے سے تھی۔

اکبر الہ آبادی نے انگریزوں کی ہر ایجاد کو طنز کا نشانہ بنایا اور آپ وہ پہلے شاعر ہے جنہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ ہندوستان میں ترقی کے نام پر انگریز اپنی قوت بڑھا رہے ہیں اور ان کے ایجادات اصل میں ہندوستان کی ترقی نہیں بلکہ ہندوستان کی زوال ہے۔ اکبر الہ آبادی نے انگریزوں کی ہر ایجاد، ہر نئی چیز کو طنز کا نشانہ بنایا اور اپنی شاعری طنزیہ و مزاحیہ انداز اپنا کر ہر نئی چیز پر خوب نشتر چلائے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہندوستان میں پائپ اور ٹائپ آئے تو اس حوالے سے اکبر الہ آبادی نے اس انداز سے ان چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا۔(٦:اکبر الہ آبادی،١٩٩٨ء)

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں حکمرانوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ قوم کے لیڈر سے بھی انہیں شکایت رہی ہیں کہ ہندوستان کی حالت دن بدن خراب تر ہو رہی ہیں۔ انگریزوں نے اپنے قدم ہندوستان میں جما لیے ہیں۔ لوگ متنفر ہو رہے ہیں یہاں تک کہ انگریزوں ہی کے وفادار ہو رہے ہیں۔ اپنا وقار اور آزادی چھوڑ کر غلامی کی زنجیروں میں خود کو جکڑ رہے ہیں اور قومی رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفادات کو سرِ فہرست رکھا ہوا ہے اور عوام کی خدمت اور ان کی فکر اِن کے دلوں میں رہی ہی نہیں بلکہ وہ تو عیاشی اور اپنی ہی دھن میں مگن ہے۔ اور جو رہنما اپنے فرائض کو چھوڑ کر عیاشی اور ذاتی مفادات کی طرف دوڑنے لگ جاتا ہے۔ وہ قوم پھر کبھی اُبھر کر سامنے نہیں آسکتی۔ اسی لیے اکبر الہ آبادی ان قومی رہنماؤں کو بھی نہیں بخشتے جو اپنی قوم کی پرواہ نہیں کرتے یا اپنی ہمدردی اور اپنی ایمانداری کو ظاہر کرتے رہتے ہیں لیکن حقیقت میں، باطن میں اپنے ہی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے اکبر الہ آبادی یوں گویا ہوتے ہیں۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ۔(۶: اکبر الہ آبادی، ۱۹۹۸ء)

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں ان کا ایک موضوع مذہب بھی ہے۔ جب ہم اکبر الہ آبادی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ اکبر ایک مذہبی شخصیت کے مالک تھے اور کبھی کبھی ان کے مزاج پہ ان کی فطرت غالب آجاتی تھی یعنی مذہبی حوالے سے وہ انتہائی حساس تھے اور کسی قسم کی اسلام دشمنی اور اسلام سے دوری برداشت نہیں کرسکتے تھے ساتھ میں ہندوستانیوں کے حوالے سے بھی یہی فکر ان کو کھائی جاتی تھی کہ مغربی تہذیب کی وجہ سے یہ لوگ اسلام سے دور نہ ہوجائے۔ بے پردگی، مخلوط تعلیم نظام، اخلاقی قدریں ضرور ہوں گی لیکن اکبر یہاں بالکل مذہبی شخصیت کے طور پر اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر اُن موضوعات کو قلم بند کرتے ہیں۔ آپ کو اپنے اقدار، روایات، تہذیب اور مذہب سے بے پناہ محبت اور شدید جذباتی لگاؤ تھا اور آپ مغرب اور مغربی تہذیب کو اسلام دشمن سمجھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کے حوالے سے ڈاکٹر صغرا مہدی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کی بنیادی تعلیم مذہبی تھی۔ ان کی طبیعت شروع سے ہی تصوف کی طرف مائل تھی۔۔۔۔۔ انھیں اپنے ملک، اپنی تہذیب، اخلاقی قدروں اور روایات سے شدید جذباتی لگاؤ تھا۔(۷: ڈاکٹر اصغرا مہدی، ۱۹۸۱ء)

مذہبی ہونے کی وجہ سے آپ اپنے لوگوں کی فکر میں رہتے تھے اور ساتھ میں اسلام کی بالادستی بھی چاہتے تھے ۔ جب انگریزوں نے اعتراض کیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہوا مذہب ہے یعنی ایک طرف اعتراض تو دوسری طرف بے ادبی کے ساتھ ساتھ بے جا تنقید بھی ہو رہی تھی۔ اسی زمانے میں اکبر الہ آبادی وہ پہلے شاعر تھے جن کا ذہن اسی اعتراض کی طرف منتقل ہوا اور بہت کھلے الفاظ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری تلوار کی تو یہ دھوم دھام ہے لیکن آپ لوگوں نے کبھی اپنی ''توپ'' پر نظر ڈالی ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور کیا کرتی ہے؟ مزید کہتے ہیں بالفرض مان بھی لیا جائے کہ ہم نے شمشیر کے ذریعے اپنے دینِ اسلام کی تبلیغ کی اور اسلام کو پھیلایا تو ہمارا واحد مقصد توحید و رسالت رہا۔ جنگیں صرف اس لیے کی کے دوزخ کی دائمی آگ سے آپ کو بچا سکیں اور جنت جو کہ نہ ختم ہونے والی زندگی کا نام ہے اس کا رستہ دکھا سکیں۔ ہمارا مقصد مے فروشی، عیاشی، تباہی، زن پرستی اور حرص و لالچ نہیں رہی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توپ سے تو لوگ، قبیلے، شہر، گاؤں تباہ و برباد ہوتے ہیں اور یہ ایجاد بھی آپ لوگوں کی ہے تو آپ بتائیں آپ نے توپ سے کیا پھیلایا؟ انہیں باتوں کا اظہار اکبر الہ آبادی اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں۔

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پرواہے غلط الزام بس اوروں پہ لگار کھا ہے یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلامیہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے۔(۸: اکبر الہ آبادی، ۱۹۹۸ء)

توپ تو ناتواں قوموں کو ہلاک کرنے، ان کے گھروں، عورتوں اور ملک پر قبضہ کرنے اور پھر انہی ملکوں میں اپنی درسگاہیں کھولنے اور انہیں جسمانی غلامی کے ساتھ دلوں، دماغوں اور روحوں کو بھی غلامی کی زنجیریں ڈالنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کمزور اقوام کے مقابلے میں مضبوط اقوام کی جنگ ہو یا صلح دونوں کا مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ اُن کی روحوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنایا جائے۔ ایسی تلخ حقیقت کو اکبر الہ آبادی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ توپ کِھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے۔(۹:اکبر الہ آبادی،۱۹۹۸ء)

اکبر الہ آبادی کی شاعری کا ایک موضوع سرسید احمد خان بھی رہے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اکبر الہ آبادی، سرسید احمد خاں سے نفرت نہیں کرتے تھے بلکہ نظریاتی اختلاف اور مغربی تہذیب کی طرف جکاؤ کی وجہ سے اکبر، سرسید کے خلاف رہے۔ دونوں اپنی اپنی طرف سے اپنی قوم کی بھلائی کے لیے مصروفِ عمل تھے۔ اپنی قوم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کوشاں تھے لیکن دونوں کا طریقہِ کار ایک دوسرے سے جدا تھا یعنی یوں کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد میں تھے۔ اکبر مشرق تو سرسید کو مغربی سمت میں جاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے۔ دونوں کا اختلاف مشرق اور مغرب تھا۔ اکبر الہ آبادی کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم دوسروں کا سہارا نہ لیں، دوسروں کے نقش و قدم پر نہ چلیں، دوسروں کی روش اختیار نہ کریں اور اپنے بل بوتے پر آزادی کے لیے کوشاں رہے بلکہ اپنی روایات، کارناموں اور اپنے ہی قدروں پر بھروسا رکھ کر اپنی نجات خود تک محدود رکھیں۔ یعنی خود ہی آزادی، ترقی اور خوشحالی کے لیے جدوجہد کریں اور مغربی تہذیب، روایات اور مغربی تعلیم پر انحصار نہ کریں بلکہ اس سے اتنا دور رہیں کہ ہماری اخلاقی قدریں مجروح نہ ہو۔ جب کہ سرسید احمد خاں مغربی تہذیب، جدید تعلیم اور مغربیت کے حامی تھے۔ سرسید کو اپنی اور اپنے قوم کی فلاح اسی میں نظر آرہی تھی کہ ہماری قوم جدید تعلیم حاصل کرے گی تو ہی انگریزوں اور ہندوؤں کے ہم پلہ ہوگی۔ آپ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے اور زمانے کے مطابق، زمانے کی روش کے ساتھ خود بھی اور اپنی قوم کو بھی چلانا چاہتے تھے۔ اسی کشمکش میں وہ زمانہ گزرتا رہا۔ اکبر الہ آبادی مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اور اپنی قوم کو مشرقی تہذیب میں ہی پنپنا چاہتے تھے جبکہ سرسید احمد خاں جدید تعلیم اور مغربیت کے حامی تھے۔ سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم کی بنیاد علی گڑھ کالج سے باقاعدہ طور پر ڈالی اور ہندوستانیوں کو جدید تعلیم دینے کے لیے بے پناہ کوشش اور قربانیاں دی۔ جبکہ اکبر الہ آبادی، سرسید احمد خاں کو انگریزوں کا آلہ کار اور وفادار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ سرسید احمد خاں قوم کو مغربیت کی طرف دھکیل رہی ہیں جس کی وجہ سے مغربی تہذیب میں ہندوستانی اپنا وقار کھو دینگے اور یہ سب انگریزوں کے کہنے پر کیا جارہا ہیں۔ اسی حوالے سے سرسید احمد خاں پر طنز کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں۔

ابتداء کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا انتہاء یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا۔ (۱۰: اکبر الہ آبادی، ۱۹۹۸ء)

اکبر الہ آبادی اور سر سید احمد خاں کی اس اختلاف میں مشرقیت کو فائدہ ہوا یا مغربیت کو اسی حوالے سے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

جس زمانے میں سر سید اور اکبر تھے یہ مانا جا سکتا ہے کہ اکبر کی مشرقیت گھاٹے میں رہی اور سر سید کی مغربیت نفع میں۔ (۱۱: رشید احمد صدیقی، ۱۹۶۹ء)

سر سید احمد خاں کی مغربیت نفع میں رہی اور مشرقیت گھاٹے میں لیکن ایک بات جو دونوں میں مشترک نظر آتی ہے وہ قوم کی اصلاح اور قوم کو غلامی سے نجات دلانا ہیں۔ ظاہری اور وقت کے حوالے سے مغربیت اور سر سید بازی لے گئے اور مغربیت کی دھوم مچ گئی جبکہ اکبر الہ آبادی پیچھے رہ گئے اور وہ جس تہذیب کے دلدادہ تھے وہ آخر کار آہستہ آہستہ دم توڑ گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ نئی تہذیب نے ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے اور ہندوستان اپنی مشرقی روایات کو طاق پر رکھ چکی تب اکبر الہ آبادی کی دور اندیشی، باریک بینی وقت اور حالات کے مطابق درست ثابت ہوئی یا سر سید احمد خاں کی ؟اس سوال کا جواب رشید احمد صدیقی ان الفاظ میں دیتے ہیںَ

اکبر کا عقیدہ تھا کہ ہم کو اپنے کارناموں اپنی روایتوں اور اپنی قدروں پر بھروسا کرنا چاہیے اور اپنی نجات اپنے ہی ترکہ میں تلاش کرنا چاہیے۔ اکبر کا یہ نظریہ آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ سر سید کا سالک "مقامات میں کھو گیا"۔ سر سید جس مغربیت کے حامی تھے اس نے بالآخر اپنے سے پناہ مانگنی شروع کر دی۔ زیادہ دور تک دیکھنے کا صحیح طریقہ یا مفہوم یہ ہے کہ جتنا آگے دیکھ سکتا ہو اتنا ہی پیچھے بھی دیکھ سکتا ہو اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ بلند ہو کہ زیادہ علیحدہ ہو کر دیکھے۔ (۱۲: رشید احمد صدیقی، ۱۹۶۹ء)

ہر شاعر کی شاعری میں زمانے اور زندگی کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن زیادہ تر ایسے نقوش واضح اور جیتے جاگتے دکھائی نہیں دیتے جتنے اکبر الہ آبادی ہے ہاں مکمل اور بڑی واضح صورت میں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے مقابلے میں دوسرے شعراء کے ہاں نقوش دریافت کرنے میں کافی دشواری، بڑی چھان بین، بے حد الٹ پھیر اور خواہ مخواہ کی خوش عقیدگی کو داخل کرنا پڑتا ہے جبکہ اکبر الہ آبادی کے ہاں ایسی صورتِ حال نہیں ہیں۔ ان کے ہاں تمام تقوش

، تمام موضوعات بڑی وضاحت کے ساتھ ملتے ہیں۔ کہی پر قلندرانہ آہنگ تو کہی پر شاعرانہ رنگ، تراش خراش کے ساتھ تو کہیں پر جوں کی توں، کہی پر انقلابی تو کہی پر رویتی رنگ کے ملتے اور بڑی فصاحت وبلاغت کے ساتھ ملتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کا اُردو طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے ساتھ بے تکلفی کا رشتہ ہے۔ جس قدر اکبر الہ آبادی نے اُردو شاعری کے ساتھ بے تکلفی برتی ہے شاہد ہی کسی اور شاعر نے برتی ہو۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ جس موضوع کو چاہا اٹھایا اور جیسی زبان چاہی بیان کر ڈالی اور جو لہجہ دل کو بھایا وہی اختیار کر لیا۔ آپ نے ہر ایک بات کو ہر ایک کی زبان میں بیان بہترین انداز کے ساتھ بیان کر ڈالی۔ شاعرانہ زبان تو کہی مولویوں کی زبان، صوفیوں، عوام اور سب سے الگ اور بڑی عام شخص کی زبان اپنائی اور ساتھ میں اس زبان، لہجے اور انداز کا مکمل حق بھی ادا کر لیا۔ آپ زبان وبیان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

اگر ہم اُردو ظرافت کی مکمل تاریخ مرتب کرنا چاہے تو ہم کلامِ اکبر سے یہ پوری طرح ترتیب دے کر مرتب کر سکتے ہیں۔ آپ کا کمال اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ زبان، اسلوب کو ہر قسم کے موضوعات کو ہر اعتبار سے بیان کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ہر طرح کے جذبات وخیالات کو بیان کرنے پر قادر تھے۔ آپ کی وہ خصوصیت جو آپ کو منفرد مقام عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی بات لوگوں تک، ان کے دلوں تک اور ہر شخص آپ کی بات اور مطلب تک با آسانی پہنچ جاتا تھا۔ اسی وجہ سے آپ تکلف سے کام نہ لیتے اور ہر بات فی الفور اور براہ راست ہی کہہ ڈالتے تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا کہ آپ کہتے بھی نہیں تھے کہنے کے بجائے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے تھے۔

اکبر الہ آبادی ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصلح قوم بھی ہے جن کو بھولنا نہ ممکن ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارے دلوں اور اُردو ادب میں زندہ وجاوید رہے گے۔

حوالہ جات

۱ : شمس الرحمان فاروقی، نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار، ۱۲ فروری ۲۰۰۲ء، جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی، ص ۳۴

۲: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۵

۳: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۶۷

۴ : پنڈت کشن پرشاد کول، اکبر الہ آبادی اور ان کی شاعری، علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جامعہ ملیہ لمٹیڈ، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص ۴۱،۴۰

۵: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۸۹۷

۶: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹

۷: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۴۳

۸: صغرٰا مہدی، ڈاکٹر، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامع لمیٹیڈ، نئی دہلی، اشاعت اول ۱۹۸۱ء، ص ۲۰

۹: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۵

۱۰: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۹۸۷

۱۱: سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، نارنگ ساقی (مرتب و مدون)، میڈیا انٹر نیشنل، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۹۸

۱۲: رشید احمد صدیقی، اکبر الہ آبادی نمبر، مدیر، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، عارف پرنٹر آف پریس گارڈن مارکیٹ، کراچی، سالنامہ ۱۹۶۹ء، ص ۳۱

۱۳: رشید احمد صدیقی، اکبر الہ آبادی نمبر، مدیر، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، عارف پرنٹر آف پریس گارڈن مارکیٹ، کراچی، سالنامہ ۱۹۶۹ء، ص ۳۲